مغربی سیاسی افکار کی تاریخ پر ایک نظر

نثار احمد

یہ موضوع اتنا متنوع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے جملہ پہلوؤں پر بحث کسی ایک مضمون میں نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ہمیں لامحالہ اپنا جائزہ ایک خاص پہلو تک محدود کرنا ہوگا۔ البتہ اس کے ضمن میں دوسرے مباحث کی طرف اشارہ یا تبصرہ ناگزیر ہے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیاسی فکر و عمل کی پوری تاریخ کا اصل محور "ریاست" کا ادارہ ہے۔ ریاست کیا ہے؟ اس کی نوعیت و ماہیت کیا ہے؟ اس کے بنیادی عناصر ترکیبی مقاصد اور طریقہ کار وغیرہ سے متعلق سوالات ایسے ہیں جن سے شاخ در شاخ علم سیاسیات کا پورا چمن ترتیب پاتا ہے۔ اسی لیے علم سیاسیات کو علم ریاست سے تعبیر کرنا عین حقیقت معلوم ہوتا ہے[1]۔ اور ہمارے لیے بھی آسان راستہ یہی ہے کہ ریاست کے حوالے سے مغرب کے سیاسی افکار کی طویل تاریخ کا ایک عمومی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

(۱)

ریاست یا مملکت کے لیے انگریزی زبان میں اسٹیٹ (STATE) کا لفظ مستعمل ہے جو کہا جاتا ہے کہ یونانی زبان کے لفظ (STATUS) سے ماخوذ ہے[2]۔ یوں تو بنیادی طور پر اس کے

---

[1] ۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز، سنہ ۱۹۵۱ء، ج ۱۱، ۱۲، ص ۲۲۴

[2] ۔ شپلے، جوزف ۔ ٹی ۔ ڈکشنری آف ورڈز اور پھریز ۔ فلاسفیکل لائبریری ۔ نیویارک، سنہ ۱۹۴۵ء ۔ ص ۲۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معنی حالات قائم اور ماحول کے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے معانی اس لفظ سے وابستہ ہیں۔ البتہ ایک مخصوص سیاسی ہیئت یا حکومت یا منظم سیاسی شخصیت کے معنی میں تاریخی طور پر اس لفظ کا استعمال سولہویں صدی عیسوی (۱۵۳۸ء) میں شروع ہوا اور اس کے تضمنات کی تکمیل غالباً اٹھارویں صدی عیسوی (۱۷۰۱ء) تک ہوئی [۳] کیونکہ جدید سیاسی ادب میں "اسٹیٹ" کے لفظ کو متعارف کرانے کا سہرا میکاولی (۱۴۶۹ - ۱۵۲۷ء) کے سر ہے [۴]

یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے اسٹیٹ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے یہاں بالعموم پولس (ΠΟΛΙΣ) کا لفظ مستعمل رہا جس کے لفظی معنی شہر (CITY) کے ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ ان کا تصور ریاست "شہر" پر مبنی اور شہر ہی کے نقطۂ نظر سے انتہائی محدود تھا [۵] اور اس سے محض ایک میونسپل ریاست [۶] کا تصور قائم ہوتا ہے نہ کہ ایک قومی یا ملکی ریاست کا۔ رومیوں نے ریاست کے مفہوم کو سیوٹاس (CIVITAS) کے ذریعہ نسبتاً وسعت کے ساتھ ظاہر کیا۔ جو اس بات کو ظاہر کرتا کہ ایک شہر کے حقوق شہریت ریاست کا مغز ہیں۔ اس سے ریاست کے علاوہ مرتبت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ رومیوں کے یہاں ایک دوسرا لفظ ریس پبلکا (RESPUBLICA) بھی ملتا ہے جو ریاست کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ نہ صرف شہریت کی طرف بلکہ ریس پوپلی (RESPOPULI) ایک قوم اور اس قوم کے فوائد پر نظر رکھنے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے [۷]

---

[۳] ولیم لٹل، فالر۔ ایچ۔ ڈبلیو، جیولسن (مرتبہ) دی شارٹر آکسفورڈ ڈکشنری۔ کلینڈرن پریس۔ لندن، ۱۹۶۵ء۔ ص ۲۰۰۵

[۴] گارنر، جیمس ولفرڈ۔ پولیٹکل سائنس اینڈ گورنمنٹ ورلڈ پریس، کلکتہ۔ ص ۴۷

[۵] بلنچلی جے۔ کے۔ نظریہ سلطنت۔ ترجمہ قاضی تلمذ حسین۔ جامعہ عثمانیہ۔ دکن ۱۹۲۸ء۔ ص ۲۴

[۶] بارکر۔ ایس۔ ای۔ گریک پالیٹیکل تھیوری۔ میتھون۔ لندن، ۱۹۶۰ء۔ ص ۲۲

[۷] بلنچلی۔ ص ۲۲

لغوی معنی کے بعد دوسرا مرحلہ "تعریف" کا ہے۔ قدیم و جدید مفکرین نے ریاست کی بے شمار تعریفیں کی ہیں اور قابل غور امر یہ ہے کہ ان لاتعداد تعریفات میں سے کوئی ایک تعریف بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح علم سیاست کے اکثر موضوعات اختلافی چلے آ رہے ہیں، ریاست کی تعریف بھی اختلافات کا مرکز بنتی رہی ہے۔ کیونکہ :-

(الف) ہر سیاسی مفکر نے تعریف اپنے علم، ذاتی خیالات، سمجھ اور بصیرت کے مطابق کی ہے۔ چنانچہ ماہرین عمرانیات نے اسے ایک معاشرتی ادارہ قرار دیا تو فقہاء اور قانون دان طبقہ نے اسے ایک قانونی ادارہ سمجھا، بین الاقوامی قانون کے علماء نے اپنے ذوق کے مطابق اس کی حیثیت متعین کی۔ اسی طرح فلسفیوں نے اسے اپنے خیالات کے مطابق بیان کیا۔ مثلاً ارسطو کی تعریف[۸] اور اس کا یہ بیان کہ ریاست "فطرت کی تخلیق" ہے[۹] اس کے علاوہ سسرو گروشیس (GROTIUS) ، بودین، ہالینڈ، ہال (HALL) ، برجیس، بلنشلے، اسمین (ESMEIN) ، ڈرگٹ (DURGUIT) ، مالبرگ (CARR'E de MALBERG) ، فلمور (PHILLIMORE) بوسانکے، ہیگل وغیرہ کی تعریفات[۱۰] سے امور بالا کی تائید ہوتی ہے۔

(ب) اکثر مفکرین نے اپنے دور کے مخصوص حالات کے پیش نظر ریاست کی تعریف کی[۱۱] اس لیے حالات کے بدلتے ہی تعریف بھی بدل گئی اور ایک دور کے بعد وہ دوسرے دور کے لیے ناقابل قبول ٹھہری۔

---

[۸] گارنر۔ ص۔ ۵۰۔ بحوالہ "سیاسیات" ترجمہ جاوٹ (JOWETT)

[۹] گریوز۔ ایچ آر۔ دی فاؤنڈیشن آف پالیٹیکل تھیوری۔ ایلن اینڈ ان ون لمیٹڈ۔ ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۱

[۱۰] ایضاً نیز: گارنر ص۔ ۵۰ تا ۵۲

[۱۱] "کوئی بھی سیاسی فلسفہ اپنے دور کے مخصوص حالات سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور سیاسی حکماء و فلاسفہ کے بڑے بڑے کارنامے (مثلاً) میکاویلی کی کتاب پرنس، ہابس کی لیویا تھن (LEVIATHAN) ، روسو کی معاہدہ عمرانی ایسے سیاسی وسائل ہیں جو ان کے اپنے زمانے کو مخاطب کرتے ہیں" (بارکر۔ ص ۱۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہر حال لفظی اختلافات سے قطع نظر اگر ہم تعریفات کے ماحصل پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ریاست کے مفہوم میں "سیاسی ماحول، سیاسی تنظیم، سیاسی اقتدار کی مختلف شکلیں، تمام سیاسی سرگرمیاں، تمام سیاسی شخصیات اور ہر وہ چیز داخل ہے جو حکومت سے متعلق ہو۔ یا کسی ملک کی با اختیار سیاسی قوت سے مربوط و متعلق ہو" [۲۱]

اب جہاں تک ریاست کے عناصر ترکیبی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مفکرین اور علمائے سیاسیات، ریاست کے چار عناصر ترکیبی یعنی آبادی، رقبہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ پر زیادہ تر متفق نظر آتے ہیں [۲۲] کیونکہ لفظی یا اصطلاحی فرق کے باوجود سب کا مدعا ایک ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ہر مفکر کے نزدیک ان عناصر کا وجود ایک ریاست کی تشکیل و ترتیب کے لیے گویا لازمی امر ہے۔ ان چاروں عناصر کو اگرچہ مختلف الفاظ و اسالیب سے موسوم کیا گیا ہے اور تشریحات و اقسام کے ذریعہ خاصہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے [۲۳] تاہم لفظی اختلافات کی تہہ میں متذکرہ عناصر کا لزوم بالکل منطقی اور حقیقی ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاست کا قیام زمین کے کسی نہ کسی خاص حصے، رقبے، علاقے پر ہوگا اور یہ علاقہ بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ جہاں انسان رہتے ہوں۔ ایک خاص رقبہ میں رہنے والے انسانوں کو مربوط کرنے، ان میں اعتدال قائم کرنے، ان کے حقوق و فرائض کے تعین، اور

---

[۲۱] ولیم للل وغیرہ ص ۲۰۰۵ (ابسلسلہ لفظ "اسٹیٹ")

[۲۲] گلکرائسٹ۔ آر۔ این پرنسپلز آف پالیٹیکل سائنس۔ مدراس ۱۹۵۵ء۔ ص ۲۱

[۲۳] مثلاً آبادی کے سلسلے میں ارسطو اور روسو علاقے کے ضمن میں بلنچلی، حکومت کے ذیل میں افلاطون و ارسطو، میریٹ اور لیکاک کی تقسیم، تقسیم اختیارات کے تحت مونٹیسکو اور بلیک اسٹون، قومیت کے ضمن میں برجس، برائس، اربناں، گلکرائسٹ اور زمیرن، عناصر قومیت کی تفصیل میں ان کے علاوہ نطشے، جان اسٹورٹ مل اور ایکٹن، نیز اقتدار اعلیٰ کی بحث میں بودین، گروشیس، جیلینک، ولوبی، ہابس، لاک، روسو، بینتھم، آسٹن، میک آئیور، بارکر، ڈیوگٹ، میٹ لینڈ، گیارکی، ہیگل اور لاسکی وغیرہ کے افکار و نظریات کا مطالعہ اہم اور سیاسی فکری ادب کا عظیم الشان سرمایہ ہے۔

زندگی کے مکمل اظہار کے لئے ایک نظم حکومت اور حاکم کی ضرورت ہے اور سب سے زیادہ پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی ایسی ذات اور شخصیت بھی ہو جو ان تمام عناصر پر بالادستی اور فوقیت رکھتی ہو۔ یہی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ ہے جسے ہم ایسی قوت قاہرہ سے موسوم کر سکتے ہیں جو دراصل ریاست کی حقیقی بنیاد ہوتی ہے۔ بلکہ ریاست کی بقاء کا انحصار بھی اسی عنصر پر ہے۔ اس کے بغیر نہ تو ریاست کا رُخ متعین ہو سکتا ہے، نہ احکام کا وجود و وجوب اور اطلاق و نفاذ ممکن ہے اور نہ ریاست کے تمام عناصر ترکیبی میں انضباط برقرار رہ سکتا ہے۔ ہمیں یہاں اس تفصیل سے بحث نہیں ہے جو بجائے خود اقتدار اعلیٰ کے تصور کے سلسلے میں سیاسی لٹریچر میں موجود ہے۔ ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ ان عناصر کی اہمیت اور ریاست کی تعمیر و تشکیل کے باب میں ان کا کردار پیشِ نظر رہے۔

جن مفکرین سیاست نے ریاست کی ضرورت سے بحث کی ہے اور اس کے مقاصد کا تعین کیا ہے[۱۵] ان کا مرکزی استدلال یہ ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے[۱۶] یعنی ایک انسان دوسرے انسان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ معاشرہ انسانوں سے مل کر ہی بنتا ہے اور انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام مراحل میں معاشرہ کا ہی محتاج ہوتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک "وہ جاندار جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا یا جسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ حیوان ہے یا خدا ہے"[۱۷]۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہر انسان کے

---

۱۵ مقاصد ریاست کی بحث بھی کافی طولانی اور پہلو دار ہے۔ ایک مسئلہ تو یہی ہے کہ ریاست بجائے خود مقصد ہے یا مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا دونوں؟ اس ضمن میں بالترتیب افلاطون، ارسطو، میکاویلی، ہابس، کانٹ، ہیگل، بوسانکے، بینتھم، مل، اسپنسر، ولوبی، بلنچلی اور اجتماعی و اشتراکی مفکرین کے نظریات قابل غور ہیں۔ دوسرا مسئلہ مقاصد ریاست کے تعین کا ہے، مثلاً افلاطون کے نزدیک انصاف کا قیام، ارسطو کے خیال میں زندگی کی بقا اور اس کا تحفظ، ریاست کا مقصد ہے۔ ہابس امن و امان، حفاظت جان و مال، لاک انسانوں کے فطری حقوق کی حفاظت اور روسو ارادہ عامہ کا تحفظ اقتدار، ریاست کے مقاصد میں شمار کرتا ہے۔

۱۶ ارسطو۔ دی پالیٹیکس۔ مرتبہ سنکلیر ٹی۔ اے (انگریزی) فصل اوّل۔ باب دوم۔ ص ۲۸۔

۱۷ ایضاً۔ ص ۲۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

داعیات، جذبات، مفادات اور ضروریات کا دائرہ جُدا جُدا اور مختلف ہوتا ہے اور ان کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے اس کی جدوجہد اور کوششیں بھی مختلف راستے اختیار کرتی ہیں۔ اس بناء پر اپنے ابنائے جنس میں اس کا "اختلاف" بھی ایک فطری امر بن جاتا ہے اور اسی لیئے افلاطون کو مملکت کا پہلا سبب انسان کی خواہشوں کے "اختلاف" اور ان خواہشوں کے پُورا کرنے میں ضرورتِ امداد باہمی کے اندر نظر آتا ہے[۱۸]۔ بہرحال انسانوں اور انسانوں کے درمیان حقوق و فرائض کے تعین کے لیے انہیں کشت و خون اور فتنہ و فساد سے بچانے اور ظلم و ناانصافی سے روکنے کے لیے ایک قانون، ایک تنظیم اور ایک ریاست کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ان تمام مفکرین کے نزدیک ریاست کا قیام بنیادی طور پر ایک سلبی ضرورت اور منفی رویہ کا مظہر ہے۔ البتہ ثانوی درجہ میں ریاست کے فرائض و مقاصد اثباتی بن جاتے ہیں مثلاً قیام امن و عدل، نیکی کا فروغ وغیرہ۔ شاید اسی بات کی تائید ہالینڈ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "قانون کی ایک بالکل واضح خصوصیت یہ ہے کہ وہ طاقت پر مبنی ہوتا ہے اور اسے کسی نہ کسی انحراف و عدول اور خلاف ورزی کی وجہ سے ہی بنایا جاتا ہے[۱۹]" اور ہابس لکھتا ہے کہ "دنیا میں قانون کے وجُود پذیر ہونے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مخصوص لوگوں کی فطری آزادی کو اس طرح لگام دی جائے کہ وہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ مدد کریں اور کسی مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو کر صف آراء ہو جائیں[۲۰]" علاوہ ازیں اڈورڈ جنکس کا یہ کہنا بڑا معنی خیز ہے کہ مملکت یا سیاسی معاشرہ کی ابتداء "فن حرب" کی ترقی سے ہوئی۔ "جنگ" سے سیاسی معاشرہ کی ابتداء ہونے پر افسوس ہوتا ہے مگر یہ بات ہے واقعی صحیح[۲۱]۔

---

[۱۸] ڈننگ - ولیم آرچ بالڈ - ترجمہ قاضی تلمذ حسین - جامعہ عثمانیہ - دکن ۱۹۴۴ء ج ۱، ص ۲۹

[۱۹] ہالینڈ - ایس ٹی ای - دی ایلیمنٹس آف جورسپروڈنس - کلینڈرن پریس لندن - ۱۹۲۴ء - ص ۷۹

[۲۰] ایضاً - بحوالہ (LEVIATHAN)

[۲۱] اڈورڈ جنکس - تاریخ سیاسیات - ترجمہ مولوی محمد عبدالقوی - جامعہ عثمانیہ - دکن - ۱۹۴۵ء - ص ۷۷

ریاستوں کی تشکیل و ترتیب کے مراحل پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ریاست کے تمام اجزائے ترکیبی (رقبہ، آبادی، حکومت اور اقتدار اعلیٰ) اپنے وجود میں ایک خاص ترتیب سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یعنی زمین، رقبہ یا علاقہ پہلے سے موجود ہوتا ہے، پھر آبادی، اس کے بعد حکومت اور آخر میں اقتدار اعلیٰ [۱۱] وجود پذیر ہوتا ہے۔ اسے زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ریاست پہلے وجود میں آتی ہے اور اس کا حکمران بعد میں فائز کیا جاتا ہے۔ لیکن بہ اعتبار ترتیب موخر ہونے کے باوجود آخری جزو یعنی "اقتدار اعلیٰ" ہی اصل اہمیت و اولیت رکھتا ہے۔ یہی پوری ریاست کا خلاصہ اور اس کا سب کچھ ہے۔ اسی جزو کی بنا پر ایک ریاست اور دوسری ریاست کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔ دوسرے تمام اجزائے ریاست اسی اصل کے تابع اور کل اعضائے حکومت اس کے جیطۂ اقتدار میں رہ کر کام کرتے ہیں۔

مفکرین سیاست عام طور پر ریاست کی جو اقسام تجویز کرتے ہیں، ان کے تجزیے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ریاست کی ایک شکل دوسری شکل سے اور ایک قسم دوسری قسم سے یا تو بر بنائے نسل، وطن اور قومیت، ممتاز و ممیز ہوتی ہے اور یا پھر ان کا ظاہری ڈھانچہ، حکمرانوں کی تعداد اور ان کی قوت، تنظیم، افادیت وغیرہ، باہم مختلف بناتی ہے۔ گویا ان کے یہاں ریاست کی نظریاتی بنیادوں کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے یا اس کی طرف سے انتہائی بے اعتنائی برتی گئی ہے مثلاً ارسطو نے مذہبی حکومت کو تقریباً نظر انداز کر دیا ہے اور علم السیاست کے بہت سے جدید مصنفین نے بھی اسی طرف بہت خفیف سا اشارہ کیا ہے۔ حالانکہ قدیم ریاستوں میں مذہب کو غایت درجہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ مشہور اور عام قاعدے کی رو سے خاندان کے سادہ تصور کی

---

[۱۱] اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت (SOVEREIGNTY) کی اصطلاح بھی اپنے دامن میں سینکڑوں مباحث سمیٹے ہوتے ہے۔ اہل فکر و نظر نے اس پہ پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور اب بھی برابر لکھا جارہا ہے۔ البتہ دو باتوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ اول یہ کہ حاکمیت کی اصطلاح ہر دور میں مختلف ناموں سے موسوم کی جاتی رہی ہے اور دوسرے یہ کہ مغرب میں حاکمیت کا جدید اور اصطلاحی تصور سب سے پہلے بودین نے سنہ ۱۵۷۶ء میں پیش کیا۔ (گلکرائسٹ۔ ص ۹۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تدریجی توسیع سے ریاست آہستہ آہستہ وجود میں آجاتی ہے مگر تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو گاہ بگاہ ریاستیں ایک بالکل ہی دوسرے انداز یعنی مذہب کے توسل سے دفعۃً ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عظیم الشان اسلامی ریاست اس سلسلے میں روشن مثال ہے۔ سیلی مزید لکھتا ہے "ساتویں صدی میں عرب قبائل کے اندر ایک مذہبی عقیدے کا وعظ کہا گیا اور ان ہنوز کمزور وغیر متمدن آبادیوں نے دفعۃً ایک زبردست مملکت کی شکل اختیار کرلی اور ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے شہروں کی بنیاد ڈال دی، شہنشاہیوں کو الٹ دیا اور سلطنتوں کی ایک عظیم الشان وفاقیت قائم کرلی۔ جو کرۂ ارض کے ایک معتدبہ حصہ پر وسیع اور ایک مشترکہ مذہب کے توسّل سے باہم متحد تھی۔ یہ اس قسم کے مظاہر قدرت کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔"[۱۳]

(۲)

سیاسی افکار کی جو تاریخ اب تک دُنیا کے سامنے پیش کی جاتی رہی ہے اور جس میں تمام تر حصہ مغربی علما نے لیا ہے۔ صرف اسی صورت میں صحیح اور قابلِ قبول ہو سکتی ہے جبکہ اسے صرف دنیائے یورپ تک محدود رکھا جائے ورنہ ظاہر ہے دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زندگی کا ڈرامہ محض یورپ کی سرزمین پر ہی نہیں کھیلا گیا بلکہ دنیا کے دوسرے بہت سے حصے ازمنہ قدیم سے اب تک برابر عروج و زوال سے لذت آشنا ہوتے رہے ہیں۔ اس وضاحت کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی افکار کی موجودہ تاریخ اس لحاظ سے قطعی نامکمل ہے کہ اس میں بالفعل دنیا کے صرف ایک حصہ کا سیاسی نشیب و فراز اور اس کا سیاسی فکری سرمایہ سامنے آتا ہے[۱۴] جبکہ دُنیا کے دوسرے حصوں کے بارے میں یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ان کا نہ تو کوئی سیاسی و فکری سرمایہ ہے، نہ ان میں ریاست و حکومت کا شعور عمل واقع ہوا ہے اور نہ ہی وہ کشاکش حیات سے واقف ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایسے عجیب حقائق

---

[۱۳] سیلی، سر جے آر۔ تقریب علم السیاست (خطبات کے دو سلسلے) ترجمہ قاضی تلمذ حسین جامعہ عثمانیہ۔ دکن۔ سنہ ۱۹۲۹ء۔ ص ۵۴

[۱۴] حالانکہ یہ تاریخ کی ایک واضح حقیقت ہے کہ قدیم یونانی فلسفہ کے نقطۂ آغاز (تقریباً۔۔۔ ق م) سے بھی پیشتر بہت سی مشرقی تہذیبیں اپنے انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں (مثلاً مشرق بعید میں چینی تہذیب جنوبی ایشیا میں برصغیر پاک و ہند کی قدیم ہندی تہذیب اور مشرق وسطیٰ میں بابل و نینوا اور وادی نیل میں قدیم مصری تہذیب وغیرہ وغیرہ) لہٰذا سیاسی فلسفہ تاریخ میں ان تہذیبوں کے فکری اور سیاسی سرمایہ کو نظرانداز کردینا ایک ناقابل معافی تقصیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی علما نے ایک بالکل خود ساختہ ماضی تصنیف کر رکھا ہے۔

متصور ہوں گے جن کی تصدیق دُنیا کی کوئی تاریخ نہیں کر سکتی اور جن کو کوئی صاحب فکر و نظر ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا ہے[۱۵]

علم سیاسیات کے مطالعہ سے ایک اور انتہائی اہم سوال بھی ذہن میں اُبھرتا ہے اور ہم سے سنجیدہ ذہنی کاوش کا تقاضہ کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکرین سے پہلے بھی سیاسی اداروں اور سیاسی فکر کا وجود تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ افلاطون وارسطو سے پہلے تاریخ کا ایک اچھا خاصا طویل دور گزر چکا ہے جو مختلف علاقوں میں متعدد اقوام و ملل کے عروج و زوال سے عبارت ہے۔ بڑی بڑی ریاستیں اور عظیم الشان سلطنتیں نقشۂ تاریخ پر ابھر چکی تھیں اور شاہان ذی اقتدار اپنا سکہ ایک عرصہ تک مختلف علاقوں پر چلا چکے تھے۔ مصر کی درخشاں سلطنتیں، عرب کی شاندار تاریخ، چین کے سیاسی ادارے، ایران کی قدیم سلطنتیں، ہندوستان کی سیاسی وحدتیں، عصر نمرود، حضرت موسیٰؑ کا زمانہ، حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ کی بادشاہتیں وغیرہ تاریخ کی روشن اور ناقابلِ تردید حقیقتیں ہیں جن کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ نیز یہ بے شمار مثالیں اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ افلاطون وارسطو سے پہلے سیاسی اداروں کی ایک طویل تاریخ صداقتوں کے ساتھ موجود ہے اور ان واقعاتی دلائل کے ساتھ ساتھ بقول ارسطو یہ منطقی دلیل بھی موجود ہے کہ انسان ایک "سیاسی حیوان" ہے جو بغیر ریاست کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر افلاطون اور ارسطو سے پہلے انسان زندہ رہا ہے اور یقیناً رہا ہے اور اگر انسانی زندگی ان سے پہلے بھی اپنے پورے سیاسی تقاضوں کے ساتھ ارتقاء پذیر رہی ہے تو یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ:

(الف) افکار سیاسی کی تاریخ کو افلاطون وارسطو سے شروع کرنا تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

(ب) افلاطون وارسطو سے پہلے بھی ریاست اپنی تمام اشکال و اقسام اور لوازم و عناصر کے

---

[۱۵] اور دوسرا تاریخ علم کی وہ تعبیر کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے جس میں اصولاً یونان کے بعد صرف یورپ کو جگہ دی جائے یا جس سے ذہن پر یہ اثر مرتب ہو کہ ارتقائے انسانی کا عمل اصولاً اور اساساً تو صرف ایک سرزمین میں جاری رہا۔ باقی دُنیا کی حیثیت ضمنی تھی۔ سارٹن۔ جارج۔ مقدمہ تاریخ سائنس (اردو ترجمہ) نذیر ساری۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ۱۹۵۷ء۔ ج احصہ ا۔ ص ا)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ موجود تھی اور لوگ ہر زمانہ میں کسی نہ کسی خطہ میں اور کسی نہ کسی قوت قاہرہ کے تابع اور ایک نظم کے پابند رہ کر شہری اور ملکی بنیادوں پر زندگی گذارتے تھے۔ وہ شہری اور قصباتی طرزِ زندگی کے امتیاز سے بھی بخوبی واقف تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری معلومات ان کے بارے میں ناقص اور نامکمل ہیں اور جس کا اعتراف بجا طور پر ایک مشہور عالم سیاسیات نے اس طرح کیا ہے "میرے خیال میں اس دعویٰ میں مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ ابتدائی سیاسی خیالات کے متعلق ہمارا علم نہایت مبہم ہے اور اس کی حد بندی کرنا ناممکن ہے۔ حال کی تحقیقات سے قدیم ادارات کے متعلق ہماری واقفیت میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے مگر ان ادارات کی توجیہہ و تصریح میں قدیم حالات کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ زیادہ تر موجودہ زمانے کے میلانات سے ان کی توجیہہ کی جاتی ہے"۔[۲۶]

(ج) افلاطون وارسطو کے افکار سیاسی دراصل ان حالات کے تابع ہیں جو ان کے زمانے میں پائے جاتے تھے اور اسی لیے بارکر کا نقل کردہ یہ قول مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے سیاسی فلسفے "عملاً فلسفۂ ایتھنز ہیں یا اسپارٹا"۔[۲۷]

انہوں نے جن محدود و مختصر شہری ریاستوں (CITY - STATES) کو دیکھا، انہی کے مطابق اظہارِ خیال کر دیا۔ اس طرح بنیادی طور پر ان کے افکار و خیالات درحقیقت "شہری ریاستوں" کے تابع ہیں نہ کہ "شہری ریاستیں" ان کے افکار کا نتیجہ۔ یہاں ہمیں یہ تو نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ "شہری ریاستیں"، جن کا حوالہ افکار سیاسی کے مطالعہ میں عموماً اور یونان کی تاریخ سیاسیات میں خصوصاً بار بار آتا ہے (اور جو تمام غیر مسلم مفکرین سیاست کے نزدیک مثال و معیار کا درجہ رکھتی ہیں) مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہیں۔

۱۔ "شہری ریاست" پورے یونانی سیاسی فکر کا محور اور خلاصہ ہے۔

۲۔ قدیم یونانی سیاسی فکر پر اگر ایک طرف "یونانی علم الاصنام اور جغرافیائی و طبعی عوامل کا اثر پڑا تو دوسری طرف بیرونی اثرات ان میں جذب ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ "شہری ریاست" کا تخیل بھی

---

[۲۶] ڈننگ۔ ج ۱، ص ۵ (از تمہید)

[۲۷] بارکر۔ ص ۱۵

غالباً یونانیوں کی ایجاد نہیں بلکہ مشرق سے مستعار و مستفاد ہے۔ چنانچہ "ہمیں جس پہلی شہری ریاست" کا علم ہو سکا وہ چار ہزار سال قبل مسیح میں جنوبی دوآبہ دجلہ و فرات کے اندر "سمیریون" کی سرزمین میں تھی[28] اور کریٹ کے منوی (MINOAN) (۲۳۰۰ ق م تا ۱۱۰۰ ق م)۔ غالباً سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے یورپ میں "شہری ریاست" کی تہذیب قائم کی اور یونانی تہذیب کی ترتیب، تشکیل میں، ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔"[29]

۳- ان ریاستوں کی تاریخ بڑے پیمانے پر رقیبانہ طاقتوں کی تاریخ ہے، جو پڑوسیوں پر اپنی مرضی ٹھونس کر محفوظ و مامون رہنے کی تلاش میں رہتی تھیں۔[30]

۴- یونان کے سواحل، اندرون ملک جزائر اور نوآبادیوں میں اس قسم کی ریاستیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور تعداد میں ڈیڑھ سو سے متجاوز تھیں۔ یہ مختلف رقبے اور اطراف میں ہونے کے باوجود اپنی وسعت کے لحاظ سے بلدیاتی اداروں سے تعبیر کی جا سکتی ہیں[31] چنانچہ بلنچلی نے لکھا ہے "یونانی سلطنتیں یونانی قوم کے متفرق اجزا۔ اور ان کی نسلوں کی تقسیم در تقسیم سے مرکب تھیں اور ان کی حیثیت شہری جماعتوں سے کچھ زیادہ ارفع نہ تھی۔ پس اس طرح اس پر رفعت تخیل کی مادی صورت انتہائی حقیر سی تھی۔ اگرچہ یہ تخیل کل نوع انسانی پر منطبق کیا جاتا تھا مگر عملاً وہ کسی پہاڑ کی وادی یا کسی ساحلی قطعے کی تنگ حدود کے اندر ہی اپنی "طفلانہ حیثیت" کو رونما کر سکتا تھا۔"[32]

۵- سکندر اعظم کی فتوحات سے "شہری ریاست" کا روایتی تصور لایعنی ہو کر رہ گیا۔ سکندر کی فتوحات کا یونان کی شہری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ یونانی شہروں کی انفرادیت ختم ہو گئی۔ چنانچہ اس سیاسی انقلاب کے نتیجے میں "شہری ریاست" اور اس کے مسائل یونانیوں کے دائرہ فکر سے خارج

---

[28] کرین برنٹن، جان بی کرسٹوفر، رابرٹ ایل ولف، تاریخ تہذیب۔ ترجمہ غلام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۶۵ء۔ حصہ اول ص ۵۱

[29] ایضاً۔ ص ۵۸

[30] برن اے آر۔ دی پیلیکان ہسٹری آف گریس۔ پینگوئن بکس لمیٹڈ۔ انگلینڈ ۱۹۶۶ء ص ۲۵

[31] بارکر ص ۲۲ [32] بلنچلی ص ۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگئے اور ان کی سیاسی فکر انحطاط پذیر ہوگئی۔

(د) افلاطون و ارسطو سے پہلے بھی ایسے مفکرین اور مصلحین گزرے ہیں جنہوں نے سیاسی و معاشی ادارات کی تشکیل و تہذیب میں بھرپور حصہ لیا اور سیاسی فکر اور ادارت دونوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ مثلاً گوتم بدھ[۲۳] (۵۶۷ ق م) یا کنفیوشس[۲۴] (۵۵۱ ق م) وغیرہ۔ لیکن ان مصلحین سے آگے بڑھ کر ان انبیاء و رسلؑ کا تذکرہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جنہوں نے فی الحقیقت انسانیت کی صورت گری میں مؤثر کردار ادا کیا اور دُنیا میں جتنے بھی مفید ادارے موجود ہیں اور فکر صالح کی جو شکل بھی کہیں نظر آتی ہے وہ ان ہی کا بقایا ہے۔ کیونکہ یہ بات طے ہے کہ مذہبی ادارات، سیاسی ادارات سے زیادہ قدیم ہیں[۲۵] اور ظاہر ہے مذہبی ادارات کے بانی یقیناً انبیاء و رسلؑ ہی رہے ہیں۔

(۳)

انبیاء و رسلؑ فکر سیاسی کے حقیقی معمار تھے وہ لوگوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے دُنیا کے مختلف حصوں میں، مختلف زمانوں میں، مبعوث ہوتے رہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہوں نے کم از کم حاکمیت خداوندی، اطاعت پروردگار، عظمت بنی آدم، علم آزادی، مساوات، سچائی، انصاف، امانت اور اخوت و پرہیزگاری کے نظریات پیش کیے اور ان پر عمل بھی کر کے دکھایا اور یہی

---

[۲۳] گوتم بدھ کے نزدیک ریاست کا قیام اس لیے ضروری تھا کہ لوگوں کو فتنہ و فساد سے روکا جائے اور ظلم و جبر کا انسداد کیا جائے۔ چنانچہ لوگ یکجا ہوئے اور انہوں نے اپنے مفاد باہمی کے لیے ایک حکمران کو انتخاب کر کے مملکت کی بنیاد قائم کی۔ مہاتما کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برہمنی دور کی انانیت کو توڑ کر عوام الناس کے فائدوں کو مقدم رکھا۔ سنسکرت کے بجائے عام فہم پالی زبان کو رواج دیا۔ اس مذہب کے حکمرانوں اشوک (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م) اور کنشک (۳۰۵ ق م) نے پرہیزگاری اور انصاف کی حکومت کا اعلان کیا (غازی۔ حامد الانصاری۔ اسلام کا نظام حکومت۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ ۱۹۴۴ء۔ ص ۱۵، ۷۰)

[۲۴] کنفیوشس کے نظریہ سیاسی کی رو سے مملکت کے فرمانروا کو بیک وقت امیر اور حکیم ہونا چاہیئے۔ (غازی۔ ص ۱۵ بحوالہ دائرۃ المعارف مذہب و اخلاق۔ ج ۴۔ ص ۱۶۔ جیمس ہیسٹنگز)

[۲۵] سیلی۔ ص ۵۵۔ ۵۶

وہ تصورات ہیں جن پر دراصل کسی بھی صحت مند سیاسی و اجتماعی فکر اور ادارہ کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ ان انبیاء و رسلؑ نے صرف زبانی دعوؤں ہی سے کام نہیں لیا بلکہ بلاشبہ انہوں نے قوموں کی رہنمائی اور امامت کی ہے اور بحیثیت مجموعی وہ سب کے سب امامت کبریٰ UNIVERSAL LEADERSHIP) کے داعی اور نقیب تھے۔ ہر پیغمبر "خلیفۃ اللہ فی الارض" تھا اور نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی رہنما بھی تھا۔ کیونکہ بقول ابن خلدون "شرائع (شرعی قوانین) اسی لیے اپنے مرکز سے آتے ہیں تاکہ ابدی سعادت کی طرف رہنمائی کریں۔ شریعتوں کا مقصد عبادت بھی ہے اور معاملات کی تنظیم بھی، انتہا یہ ہے کہ مذہب کے اصول معیار پر انسان کا اجتماعی ہیئت کے ساتھ حکومت و سلطنت قائم کرنا بھی خدائی شریعتوں کے دائرہ عمل میں داخل ہے"[۳۶] شاہ ولی اللہ نے تصریح کی ہے کہ "نبی ربانی سیاست کے ماتحت عوام الناس کے دائرہ حیات میں بھیجا جاتا ہے۔۔۔۔ خلیفہ کی حیثیت سے نبی کی ذمہ داریوں کا لحاظ کیا جائے گا تو کہا جائے گا "وہ ہستی جو سیاسیات کے اصولی قوانین کو بنی نوع انسان کے ماحول میں انصاف کے ساتھ جاری کرے"[۳۷] اور علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں "بنی نوع انسان کے دائرہ حیات میں انبیاءؑ کا آنا انسانی زندگی کی لازمی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ انسان کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حقیقی اور دائمی منافع اور نقصانات سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اصول فوائد اور جزئی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ قدرتاً یہ ضروری تھا کہ پیغمبروں کا ظہور ہو جو بنی نوع انسان کو اللہ کے احکام پڑھ کر سنائیں، انسان کو پاک نفس بنائیں، علم و فن کی طرف متوجہ کریں۔ خداوندی قانون کی تعلیم دیں، ربانی سیاست اور حکمت کے نکات سمجھائیں تاکہ انسان کے لیے اپنے بہترین مفاد اور معاش سے وابستہ رہنے اور اپنی اصلاح و فلاح کو سمجھنے کے مواقع پیدا ہو سکیں"[۳۸]

چنانچہ ہر زمانے میں ہر علاقے میں اور ہر انسانی آبادی میں اللہ کے یہ رسول و نبی آئے[۳۹] اور

---

[۳۶] غازی، ص ۵۶

[۳۷] شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعۃ المنیریہ۔ ۱۳۵۲ھ۔ باب حقیقۃ النبوۃ ص ۸۴

[۳۸] راغب اصفہانی۔ الذریعہ الی مکارم الشریعۃ الوطن۔ ۱۲۹۹ھ۔ ص ۶۸ - ۶۹

[۳۹] دیکھئے القرآن۔ سورۃ رعد (۷)، نحل (۳۶)، مومنون (۴۴)، اسراء (۱۵)، قصص (۵۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانیت کے تاریک ادوار میں روشنی کی مشعل بن کر نورانی دنیا کے سفیر کی حیثیت سے آئے [۴۰] اور ایک روشن اور تحریری قانون کتاب کی صورت میں ساتھ لائے [۴۱] اور ایک طرف تو اپنی تمام تر توجہ انسان کی اصلاح احوال اور روشن مستقبل پر مرکوز رکھی اور دوسری طرف اپنی سعی و جہد، عزم و استقلال اور تمام صلاحیتوں کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، اللہ کی حاکمیت قائم ہو اور خدا کا قانون اور اس کی مرضی اس دنیا میں بھی اسی طرح جاری و ساری ہو جائے جس طرح آسمانوں پر ہوتی ہے [۴۲] چنانچہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انہوں نے عملاً ایک وسیع

---

[۴۰] طبری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس کی رو سے انبیاءؑ اپنی مستقل جماعتی حیثیت میں "روشنی اور نور" کی قوم ہیں (فقال: یارب من ہولاء الذین علیہم النور، فقال: ہولاء الانبیاء والرسل الی عبادی، واذا فیہم رجل ہوا ضوء ہم نورا) الطبری محمد ابن جریر۔ "تاریخ الرسل والملوک۔ دار المعارف۔ مصر۔ ۱۹۶۰ء۔ ج ۱ ص ۱۵۵

[۴۱] کتاب اور رسول دونوں لازم و ملزوم حیثیت رکھتے ہیں اور ہدایت کی تکمیل دونوں سے مل کر ہی ہوسکتی ہے (صدی۔ کتاب و رسول الفیروز آبادی، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس مصطفیٰ البابی سنہ ۱۹۵۱ء۔ ص ۶) اسی لیے ہدایت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً انبیاء و رسل ؑ کی بعثت کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی نازل کرتا رہا۔ ان میں سے چند تو بہت معروف ہیں جیسے حضرت ابراہیم کے صحف، حضرت موسیٰؑ کی الواح (توریت)، حضرت عیسیٰ کی انجیل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب "قرآن" لیکن کچھ انبیاء و رسلؑ اور ان کے صحائف کا پتہ احادیث و سیر کی کتابوں سے بھی چلتا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ پر ۲۱ ورق (طبری ج ۱ ص ۱۵۱) یا ۲۱ صحائف (مسعودی۔ مروج الذھب و معادن الجوہر، مطبعۃ السعادۃ۔ مصر۔ ۱۹۵۸ء۔ طبع ثالث۔ ج ۱ ص ۴۰) نازل ہوئے جس میں حرام و حلال اور دوسرے احکام درج تھے۔ حضرت شیث پر ۵۰ صحیفے (ابن اثیر الکامل فی التاریخ) دار صادر۔ بیروت ۱۹۶۵ء۔ ج ۱ ص ۴۷) یا ۲۹ صحیفے (مسعودی ج ۱ ص ۴۰) نازل ہوئے۔ حضرت ادریس (اخنوخ) پر ۳۰ صحائف نازل ہوئے اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں تمام دنیا کے لوگوں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی خط اور قلم سے لکھنا ایجاد کیا۔ اور گھوڑے پر سواری کی (طبری ج ۱ ص ۱۷۱) سب سے پہلے خیاطی بھی کی (مسعودی ج ۱ ص ۴۰) انہیں یہ امتیاز بھی

باقی حوالہ اگلے صفحہ پر

رقبہ زمین پر حاکمیت خداوندی کی بنیاد پر چھوٹی بڑی متعدد سلطنتیں قائم کیں اور بعد میں آنے والی نسلوں نے ان کے کھنڈرات پر دوبارہ اپنی عمارات تعمیر کیں اور ان کے باقیات پر انہی مملکتوں کے نقشے استوار کیے۔

انبیاء و رسل ؑ کی ان نیابتی حکومتوں کی تعداد اگرچہ کافی ہے لیکن مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں یعنی ابراہیمی سلطنتیں[۲۳]، بنی اسماعیل کی حکومتیں[۲۴] بنی اسحاق کی ریاستیں، مملکت یوسف[۲۵]، حکومت موسیٰ ؑ، خلافت یوشع[۲۶]، خلافت یونس[۲۷] اور حضرت داؤد[۲۸] و سلیمان علیہم السلام کی شاندار سلطنتیں وغیرہ۔

حاصل ہے کہ "دین الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاست مدن اور شہری زندگی اور بود و باند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی۔ ان کے طلباء اور شاگردوں نے اپنے قبائل کی طرف واپس جا کر شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصولوں پر بسایا اور شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد (۲۰۰) کے قریب تھی جن میں سب سے چھوٹا شہر "رہا" تھا (حفظ الرحمان سیوہاروی۔ قصص القرآن ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ج ۱ ص ۸۱)

۲۲ کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ۔ پاکستان بائبل سوسائٹی۔ لاہور ۱۹۵۹ء۔ انجیل متی ب ۲۔ ۹، ۱۰، ۱۲

۲۳ ان میں مدین، تیماء اور بصریٰ وغیرہ کے علاقے میں بالترتیب (۱) مدین بن ابراہیم (آغاز حکومت ۲ ہزار سال قبل مسیح)، اصحاب الایکہ اور بنی ادوم (آغاز ۷۰۰ ق م) کی حکومتیں (دارالحکومت رقیم یا پیٹرا تھا) شامل ہیں۔

۲۴ ان میں نبطی حکومت (آغاز ۷۰۰ ق م اختتام ۱۰۶ء) علاقہ بحر احمر تا فرات، حجر، مدین رقیم کی قدیم ریاستوں کا مجموعہ، آل جفنہ کی (عرب و شام کے درمیانی علاقے میں) حکومت اور حضور کے جد اعلیٰ بنو قیدار کا اقتدار حکومت (۱۰۰۰ تا ۸۰۰ ق م) وغیرہ شامل ہیں۔

۲۵ ان کے بارے میں طبری نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ: کان لفرعون خزائن کثیرۃ غیر الطعام فسلم سلطانہ کلہ الیہ وجعل القضاء الیہ امرہ وقضاء نافذ (طبری ج ۱ ص ۲۴۷)

۲۶ دیکھئے طبری (ج ۱، ص ۴۵۷)، ابن اثیر (ج ۱ ص ۲۰۰)۔

ے حضرت یونس کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ فارس میں طوائف الملوکی کا دور تھا (طبری ج ۲، ص ۱۷، ابن اثیر ج ۱ ص ۳۶۰) انہیں اہل موصل کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا گیا (مسعودی ج ۱ ص ۲۱۳) حضرت یونس کا عہد مبارک سنہ ۶۹۰ ق م سے بھی قدیم ہے اور ان کا مقام دعوت نینویٰ (شہر) (بقیہ حوالہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

بہرحال مقصود یہ امر ہے کہ مختلف اوقات میں، مختلف علاقوں میں، جو انبیاء و رسل[ع] آتے رہے ان کے تہذیبی و تمدنی کارنامے، ان کی حکومتیں اور تعلیمات اگرچہ جزوی یا کلی طور پر محفوظ نہ رہ سکیں لیکن پھر بھی آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئیں اور بعض مفکرین کے افکار میں صدائے بازگشت بن کر ظاہر ہوئیں[۵۰]

(باقی آئندہ)

(بقیہ حواشی)

کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے (حفظ الرحمان ج ۲، ص ۲۰۴)

[۴۸] طبری (ج ۱ ص ۴۷۶) مسعودی (ج ۱ ص ۵۶-۵۷) ابن اثیر (ج ۱ ص ۲۲۳)

[۴۹] طبری (ج ۱ ص ۴۸۶)، "فلما قبض اللّٰہ داود علیہ السلام قام بعدہ ولدہ سلیمان بالنبوہ والحکم و عم عدلہ رعیتہ واستقامت لہ الامور وانقادت لہ الجیوش (مسعودی ج ۱ ص ۵۷) "ثم ملک سلیمان . . . ، سخر اللّٰہ لہ الجن والانس والطیر والریح وآتاہ مع ذلک النبوۃ و سال ربہ ان یوتیہ ملکا لا ینبغی لاحد من بعدہ، فاستجاب (اللّٰہ) لہ فاعطاہ ذلک (طبری ج ۱، ص ۴۸۶) - حضرت سلیمان کے بعد سے حضرت عیسیٰ تک کا دور انقلابی رہا ہے جس پر انقلاب انگیز واقعات پیش آئے۔

[۵۰] ابن خلدون نے ارسطو وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "حکمت لقمان" کے خوشہ چین تھے۔ (ابن خلدون - تاریخ - تصحیح الوالوفا الہورینی - طبع بولاق - ج ۲ ص ۱۸۸) اور بقول ابن کثیر قرآن میں قوم یٰسین اور اصحاب القریہ سے مراد رومی شہر "انطاکیہ" ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلسل تین رسولوں کو مبعوث کیا (البدایہ والنہایہ - مکتبہ المعارف - ریاض - طبع اول - ۱۹۶۶ء ج ۱ ص ۲۲۹ - ۲۳۰) - زنوفون (XENOPHONES) خدائے مطلق کے وجود کا اثبات کرتا ہے (یونان ص ۱۳۲) یونان میں پہلی آبادی مشرق سے آئی (ایضاً ص ۲۱) مصر کا یونانی تہذیب پر خاص اثر (ایضاً ص ۹۵)